بانگِ درا میں ظرفِ مکاں کی معنویت

(تجزیاتی مطالعہ بحوالہ حصہ اول)

محمد خرم یاسین
محمد افضال بٹ

Abstract:

This article examines the concept of "spatiality" in Dr. Muhammad Iqbal's first Urdu poetry collection, Bang-e-Dra. Iqbal’s poetry investigates how time and place influence human psychology and identity, reflecting on how physical spaces—be they natural landscapes, cultural landmarks, or sites of historical or religious significance—shape emotions, thoughts, and behavior. This analysis sheds light on Iqbal’s vision of "place" as an integral part of identity, national pride, and cultural heritage. Space in Iqbal's poetry transcends its role as a mere backdrop, emerging as an active character that affects the narrative and emotions. His verses connect profoundly with places like the Himalayas, symbolizing resilience and cultural roots, and religious sites such as Makkah and Madinah, which represent spiritual unity for the Muslim world. The study explores how spatial references in Iqbal’s work become emblems of national and spiritual identity, shaping intellectual and emotional journeys. Mountains and rivers often symbolize spiritual quests, while urban settings reflect societal issues and the challenges of modern life. Iqbal’s spatial framework invites readers to acknowledge the deep impact of environment on consciousness, transforming space from mere surroundings into a medium for philosophical reflection. Ultimately, Iqbal’s concept of spatiality is both inspirational and symbolic, offering insight into the intrinsic link between

individuals and places in his vision of a culturally and spiritually enlightened society.

انسانی مزاج پر اس کے زمان و مکان اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی ماحول میں انسان سرشاری اور مسرت محسوس کرتا ہے اور کسی میں بے زاری اور گھٹن۔ دنیا کی ہر جگہ ظرفِ مکاں کا حصہ ہے اور اپنے وظائف و کوائف کے ساتھ مخصوص ماحول رکھتی ہے۔ مختلف مقامات کے مناظر، منسلکہ رویے اور امکانات و مسائل انسانی نفسیات کو تعمیری یا تخریبی تحریک دیتے ہیں۔ عموماً دنیا بھر کے انسان اور بالخصوص شعرا، ادبا اور فلسفہ دان، مکانیت کا تجربہ اپنے اپنے انداز میں مکانی نسبت(Frame of Reference)اور نظریہ اضافت(Theory of Relativeity) کے مطابق کرتے ہیں۔ بہار، خزاں، سردی، گرمی، صبح اور شام کے اوقات، مسجد، مندر، کلیسا، دربار، دریا، سمندر، ندی، بحیرہ، محلہ، گلی، کوچہ، بازار، چوک، میدان، پارک، باغ، قبرستان، قلعہ، دیوار، برج، دروازہ، برج، مینار، گنبد، محراب، ایوان، کمرہ، ہال، سیڑھیاں، بالکونی، چھت، زیرزمین، اوپر، نیچے، اندر، باہر، چوپال، کھیت، کھلیان، گھر، مکان، عمارت، محل، قلعہ، مسجد، مندر، گوردوارہ، چرچ، آفس، فیکٹری، دکان، ہوٹل، ریستوران، اسکول، کالج، یونیورسٹی، ہسپتال، لائبریری، میوزیم، سینما، تھیٹر، سٹیڈیم، اسٹیڈیم، جمنازیم، حمام، غسل خانہ، باورچی خانہ، کھانا پکانے کا چولہا، کھانا کھانے کی میز، بستر، کرسی، الماری، دروازہ، کھڑکی، چھت، فرش، دیوار، یہ سب انسانی مزاج میں تبدیلیاں رونما کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے جذبات و احساسات مختلف اوقات و مکانات میں تغیر سے گزرتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو زمان و مکان کو انسانی تجربے سے منہا نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں تنقیداتِ عالم میں ظرفِ مکان کا مطالعہ "مکانیت" سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مطالعہ نفسیات، سماجیات اور بشریات ایسے دیگر علوم میں بھی برابر فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے انسان کی مکان سے جڑی فکر، نفسیات اور اس پر اثرات و محرکات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ زمان و مکان نہ صرف ہماری طبعی موجودگی کا تعین کرتے ہیں بلکہ فکری رویوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ادبی تخلیقات میں مکاں صرف ایک پس منظر نہیں ہوتا بلکہ ایک کردار کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ کردار پلاٹ کو آگے بڑھاتا ہے، کرداروں کی نفسیات کو ظاہر کرتا ہے اور ادب کو ایک خاص معنویت دیتا ہے۔ ظرفِ مکان، یادگاریں بناتا ہے، ثقافتی شناخت بیان کرتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کو منعکس کرتا ہے۔ ایک خاص مقام کو جس کا تعلق شہری یا دیہاتی زندگی سے ہو، عمارات یا مذہبی مقامات، سیاسی و سماجی، تدریسی اور تاریخی عمارات و مقامات ہوں، شعر و ادب میں ان کے بیانات کے بعد

انھیں نئے زاویے سے دیکھا جاسکتا ہے، ان سے متعلق شاعر یا ادیب کے ذہنی رویے اور محرکات و اثرات کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ محمد اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ "بانگِ درا" ان کے فکری ارتقا، ذہنی رجحانات، قلبی میلانات اور قادرالکلامی کے متعدد اشارات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں حرکت و عمل کا گہرا فلسفہ موجود ہے جس میں ہر عمر کے انسانوں کے لیے حظ آفرینی بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی ہے، تحریک بھی ہے، یادِ ماضی بھی ہے، مستقبل کا نظریہ بھی ہے اور یکسر نئے فلسفیانہ موضوعات پر طبع آزمائی کے حوالے سے شعری اجتہاد بھی۔ بانگِ درا کی نظموں میں اقبال نے فکر و نظر کے ایسے رنگ پیش کیے ہیں جو ان کی ملی، فکری، اور روحانی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ فکرِ اقبال میں زمان و مکان کی گہری فکری بحث موجود ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے پیش کیے گئے تمام فلسفوں میں سب سے اہم اور مشکل فلسفہ زمان و مکان ہی کا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ محمد اقبال قومیت کو خطہ زمین سے منسلک نہیں کرتے اور نہ ہی خطہ زمین کے حصول کے لیے انسانی جدوجہد کے ضیاع کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ وطنیت کی بنیاد پر ہر قسم کے تعصب کو برا سمجھتے ہیں اس سب کے باوجود، ان کے شاعری میں وطن سے محبت، اس کے مختلف مقامات سے منسلک یادیں، ان پر بجا طور پر تفاخر اور استفسارات کے ضمن میں مکانیت کے گہرے اثرات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں مثلاً "نیا شوالہ" میں خاکِ وطن کے ہر زرے کو مقدس جانتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے[1]

بانگِ درا کی نظموں میں "تصورِ مکانیت" یعنی مقامات، سرحدیں اور حدود کا تصور محض جغرافیائی مطالعے سے کہیں وسیع اور رافزوں تر ہے۔ ان کے نزدیک مکانی حدود، چاہے وہ ہندوستان کی سرزمین ہو یا عالمِ اسلام کے مقدس مقامات، قوموں کی روحانی و فکری شناخت اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی عکاسی کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کی نظموں کے حصہ اول کے عنوانات پر غور کیا جائے تو پہلی ہی نظم "ہمالہ" ایک پہاڑ کی سرگزشت، پانچویں نظم پہاڑوں پر برستے بادل "ابرِ کہسار"، ساتویں نظم "ایک پہاڑ اور گلہری"، دو متضاد قامت کی چیزوں کے درمیان مکالمہ، تیرھویں نظم اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانے والے "خفتگانِ خاک سے استفسار"، سترھویں نظم "آفتاب"، بیسویں نظم "آفتابِ صبح"، تیسوئیں نظم "سید کی لوحِ تربت"، اکتیسویں

نظم "موجِ دریا"، اڑتالیسویں نظم "کنارِ راوی" اور انچاسویں نظم "التجائے مسافر: بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی" شامل ہیں جو کہ مختلف مقامات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے حصے میں عنوانات پر غور کیا جائے تو اس میں بھی مکانیت کے بہت واضح نشانات ملتے ہیں جیسے "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام"، "اخترِ صبح"، "چاند اور تارے"، "صقلیہ"، اس کے بعد "بلادِ اسلامیہ"، "ستارہ"، "دوستارے"، "گورستانِ شاہی"، "وطنیت"، "ایک حاجی مدینے کے راستے میں"، "سیر فلک"، "فردوس میں ایک مکالمہ" وغیرہ۔

معروضی حوالے سے بانگِ درا کی تمام نظموں میں مکانیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ان میں مکان (186 بار)، صحرا (51 بار)، گھر (25) یہاں (14 بار)، وہاں (آٹھ 08 بار)، گلی (01)، بازار (02 بار)، میدان (04)، باغ (27 بار)، گنبد (03 بار)، کھیت (08 بار)، مسجد (05 بار)، مندر (05 بار)، کلیسا (08)، عدالت (01 بار)، محل (07)، دریا (50 بار)، فلک (46 بار)، زمین (54)، قمر (21) بار، آفتاب (22 بار) آسماں (46)، طور (23 بار)، انجم (40 بار) اور فلک (46 بار) اس تواتر سے شامل ہوئے ہیں۔ ظرفِ مکاں سے تعلق رکھنے والے یہ تمام الفاظ شعر کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے فریم آف ریفرنس مہیا کرتے ہیں۔ ان سے شعر کی تحریک اور مدعا و مقصد بھی سمجھ آتا ہے۔ اس ضمن میں بانگِ درا میں شاعری حقیقت اور زمین سے جڑی نظر آتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ بانگِ درا میں علامہ محمد اقبال نے زیادہ تر مکانیت کے استعارات کو فصاحت کے ساتھ قومی اور روحانی تشخص کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، جذبات کا ابلاغ اور فکر کی ترسیل کی ہے۔ ان کا تصورِ مکانیت قوم کے لیے ایک فکری راہ متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ مقامات و مناظر محض زمین کے ٹکڑے نہیں بلکہ روحانی وحدت، قومی ورثہ اور ثقافتی عظمت کے نشانات بھی ہیں۔ مثلاً، ہمالہ کا ذکر ہو یا ہندوستان کے چمن زاروں کا، اقبال نے ان جگہوں کو ہندوستان کی شناخت، عظمت، اور اس کی تہذیبی خوبصورتی کے نمائندے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی طرح، مکہ، مدینہ، اور حرم جیسے مقامات کو اقبال نے ایک ایسے روحانی مرکز کے طور پر بیان کیا ہے جہاں سے ملتِ اسلامیہ کو وحدت، عظمت اور بیداری کا پیغام ملتا ہے۔ یوں یہ کلام نہ صرف ذاتی و قومی جدوجہد کا عکاس ہے بلکہ اسلامی ملت کے لیے ایک پیغام بھی ہے۔ ان کا یہ تصورِ مکانیت ان کی شاعری کو نہ صرف ایک ادبی شاہکار بناتا ہے بلکہ اس میں ایک فکری و روحانی گہرائی بھی شامل کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک مکان اور زمان کا امتزاج انسان کی شناخت اور اس کے وجود کا ایک لازمی حصہ ہے، جس میں فرد، قوم، اور تہذیب کا کردار نمایاں ہے۔ چنانچہ بانگِ درا کی پہلی ہی نظم "ہمالہ" میں اس سے

استعاراتی خطاب، استفسار اور عظمتِ بیان اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ وہ کوہِ ہمالیہ کے سلسلے کو قومی سرحد اور طاقت کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس پہاڑی سلسلے کو وہ عظیم سرحد سمجھتے ہیں جو نہ صرف ہندوستان کو باقی دنیا سے جدا کرتی ہے بلکہ ممیز و ممتاز بھی کرتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ہمالہ، صرف ایک پہاڑ نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ کا شاہد، زمین کا تاج ہے، آسمان کا ستون اور فطرت کا آئینہ بھی ہے۔ اس کے دامن میں انسانیت نے جنم لیا، اس کے سینے میں تہذیبیں پرورش پائیں اور اس کے سایہ میں انسانوں نے امن و سکون کا گہوارہ تلاش کیا ہے۔ ہمالہ کے سبزہ زاروں نے انسانوں کو نہ صرف رزق دیا بلکہ انہیں زندگی کا فلسفہ بھی سکھایا۔ یہاں گزرنے والے ہر لمحے میں ایک کہانی چھپی ہے، ہر پتھر میں ایک راز اور ہر ندی میں ایک داستان ہے۔ ہمالہ کی چوٹیاں ہمیشہ سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہیں، یہاں سائنسدانوں نے اپنی تحقیقات کی، فلسفہ دانوں نے حقیقت کی تلاش کی اور شاعروں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ہمالہ صرف ایک جغرافیائی مقام نہیں بلکہ ایک روحانی مرکز بھی ہے۔ یہاں انسان اپنی ذات سے مل سکتا ہے اور کائنات کے رازوں کو سمجھ سکتا ہے۔ ہمالہ کی خوبصورتی اور عظمت انسان کو اس کے عارضی وجود کا احساس دلاتی ہے اور اسے فطرت کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی ہے۔ لکھتے ہیں:

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو ، دیوار ہندستاں ہے تو[2]

ہمالہ سے جڑے ہزاروں لاکھوں جغرافیائی، سیاسی و سماجی، تہذیبی اور تاریخی حوالہ جات (فریم آف ریفرنسز) اسے اس قابل بناتے ہیں کہ اس سے عالمِ تخیل میں اس سے استفسار اور انسانی تمدن کے ارتقا کی منازل کو از سرِ نو تلاش کیا جاسکے۔ ملاحظہ کیجیے:

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا[3]

علامہ محمد اقبال کی نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" گہرا فلسفیانہ شعور رکھتی ہے اور اس کو مکانی حوالے کے بنا پڑھنا ناممکن ہے۔ نظم کا عنوان ہی بہت سارے سوالات کو جنم دیتا ہے جیسے یہ کہ یہ سوال کن سے کیا جارہا ہے؟ کیوں کیا جارہا ہے؟ وہ کونسے مقامات ہیں جہاں تک زندہ انسانوں کی دنیاوی زندگی میں رسائی ممکن نہیں ہے جس کی وجہ سے خفتگانِ خاک سے ہم کلام ہونا ضروری ہے۔ نظم میں استفسارات کہ زندگی کیا ہے، موت کیا ہے، موت کی حقیقت کیا ہے اور حیات بعد از موت کیا ہے، کیاابدی زندگی میں بھی انسان اپنی خواہشات اور جذبات کا شکار رہتا ہے یا نہیں، کیا وہاں بھی انسان کو محبت، نفرت، خوشی اور غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مکان کی تبدیلی کے بعد جنم لیتے ہیں۔ ان استفسارات کا جواب مکانیت کے تصور کو روحانی اور فلسفیانہ جہات کی جانب کھینچتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے "خفتگان خاک سے استفسار" میں مکانیت کے تصور کا ایک وسیع اور گہرا فلسفیانہ تناظر پیش کیا ہے جس کے ضمن میں اس نظم کے ہر شعر کو بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ اے مے غفلت کے سر مستو، کہاں رہتے ہو تم
کہو اس دیس کی آ خر ، جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟ [۲۴]

"ایک پہاڑ اور گلہری" ایک سادہ اور دلچسپ مکالماتی نظم ہے جسے بظاہر تو بچوں کے لیے تحریر کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں مضمر استقرائی فکر ہر عمر کے لوگوں کے لیے ہے۔ نظم یہ درس دیتی ہے کہ کسی بھی ماحول میں ہر چھوٹی بڑی شے اپنی جداگانہ اہمیت و حیثیت رکھتی ہے اور اسی حوالے سے سماج میں ہر فرد

کو برابر عزت و احترام ملنا چاہیے۔ ایک جانب علامہ محمد اقبال "ہمالہ" میں ایک پہاڑ کو عزت و عظمت کا حوالہ بناتے ہیں، دوسری جانب اس نظم میں ایک پہاڑ کو عظیم و برتر ہونے کے باوجود ایک گلہری کے مقابل حقیر بنادیتے ہیں۔ یہاں ظرفِ مکاں کے حوالے کا مقام(Frame of Reference) یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ہر چیز کا اپنا ایک مقام اور کردار ہوتا ہے۔ یہ مقام محض طبعی حوالہ نہیں ہے بلکہ اس کے پسِ پشت دیگر اور بھی بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ نظم میں پہاڑ اور گلہری کا مکالمہ ملاحظہ کیجیے جس سے ہر ایک شے کی اپنی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہاں پہاڑ کا کلام دراصل ظرفِ مکاں کا استعارہ ہے جو ہر صاحبِ مقام کے لیے ہے۔

پہاڑ:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

گلہری:

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے ، خوبی ہے اور کیا تجھ میں ۵؎

"سید کی لوحِ تربت" ایسی نظم ہے جس میں مکانیت کا تعلق نفسیات اور گہرے تدبر سے جڑتا ہے۔ اس میں مکان کا تصور صرف ایک مجسم جگہ تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ انسانی نفسیات اور معاشرتی تعلقات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ نظم میں سر سید احمد خان کی قبر کو ایک ایسے مقام کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں سے زندگی اور موت، فرد اور معاشرے کے درمیان ایک گہرا تعلق قائم ہوتا ہے اور یہ محض تربت سے بڑھ کر روحانی درس گاہ ہے بن جاتی ہے ۔ نظم میں بیان ہونے والے مختلف مقامات جیسے چمن، شہر، محفل، قبر وغیرہ، مختلف انسانی تجربات اور جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چمن زندگی اور خوشی کی علامت ہے جبکہ شہر معاشرتی تعلقات اور

جد وجہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ قبر عبرت گاہ، موت اور اخروی زندگی کی علامت ہے جہاں سے انسان کو اخلاقی اقدار اور سماجی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے۔ لوحِ تربت سے وعظ و نصیحت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگ تربت ہے مرا گرویدہ تقریر دیکھ
چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ [۶]

تیسری نظم "ایک گائے اور بکری" کا مکاں ایک چراہ گاہ ہے۔ چراہ گاہ ایک حسین مقام اور وہ فریم آف ریفرنس ہے جس پر قدرت نے اپنا حسن آشکار کیا ہے۔ اس قدرتی منظر میں دو ایسے پالتو جانور مکالمے کے لیے آپہنچتے ہیں جن میں سے ایک یعنی گائے، انسانوں سے تعلق پر پریشان ہے اور دوسری یعنی بکری اس تعلق کے احسانات گنواتی ہے۔ ان کا مکالمہ محض تعلق پر نہیں بلکہ کائنات میں اپنے مقام و مرتبے اور تشخص کی تلاش سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ نظم مکانیت کے اس تصور کو تقویت دیتی ہے کہ مختلف مقامات پر انسان یا تو اپنی شناخت قائم کرتا ہے یا پھر اسے اپنی شناخت کی فکر ہوتی ہے۔ اگرچہ انسان جانوروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن وہ جنگلی جانوروں کی نسبت اس کا خیال رکھتا ہے، کھانے پینے کا سامان مہیا کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے۔ اس سے مجموعی تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ مشکلات ہر شخص کی زندگی میں موجود ہیں لیکن اس ضمن میں مثبت فکر رکھنے والے لوگ کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ چراگاہ کا سحر انگیز نقشہ ملاحظہ کیجیے:

اک چراگہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں ۷

نظم "عہدِ طفلی" میں مکاں سے منسلک فطرت کے حیرت و استعجاب اور تخیلات و استفسارات کو بیان کیا گیا ہے۔ زمین و آسمان، آغوش مادر، جنبشِ جاں، حرف بے مطلب، شورشِ زنجیر، قمر، بادل، کوہ و صحرا، دروغِ مصلحت، دید، گفتار اور استفسار جیسے الفاظ سے علامہ محمد اقبال نے ایک ایسا ماحول تشکیل دیا ہے جو بچپن کی معصومیت اور فطرت سے محبت کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ان کے نزدیک عہدِ طفلی میں یہ کائنات رفتہ رفتہ سمجھ میں آنے والی وہ کتاب تھی جس کے وہ تادیر قاری رہے۔ ایک ننھے بچے کے لیے نظم میں بیان کیا گیا حیات و کائنات سے متعلق تحیر عین فطری ہے۔ علامہ محمد اقبال نے پختہ عمر کی شاعری اور خطبات میں بھی حیات و کائنات سے متعلق بہت سے سوالات اٹھائے اور پھر ان کا جواب اسلامی حوالے سے دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی معروف خطبات "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے پہلے ہی خطبے کی ابتدائی سطور ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

> "What is the character and general structure of the universe in which we live? Is there a permanent element in the constitutionof this universe? How are we related to it? What place do we occupy in it, and what is the kind of conduct that befits the place we occupy?"8

یہی سوالات "عہدِ طفلی" میں بھی نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وسعت تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لیے
آغوش مادر اک جہاں میرے لیے
تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر ۹

نظم "ابرِ کہسار" تمثیل نگاری کا خوبصورت نمونہ ہے جس میں مکانیت کے تصور کا ایک نیا ترفع پیش کیا گیا ہے۔ یہاں "ابر" کو نہ صرف ایک موسمیاتی مظہر بلکہ ایک مسافر، رحمت بخش نعمت اور وسیع تر کائنات کے ساتھ گہرے تعلق کا پاسدار دکھایا گیا ہے۔ یہ ابر، کوہسار سے صحرا، گلزار، شہر، ویرانہ، بحر اور بن تک سفر کرتا

ہے اور ہر مقام پر زندگی کو نئی روح عطا کرتا ہے۔ ابر کا یہ گشت اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مکان صرف ایک جغرافیائی حد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تجربہ، سفر اور تبدیلی کا عمل بھی ہے۔ یہ نظم دنیا کے قدرتی مختلف مظاہر کے درمیان ربط پر بھی روشنی ڈالتی ہے جیسے بادل کا برسات کے ذریعے آسمان سے زمین کا رشتہ قائم کر دینا۔ نظم کے ہر مصرعے میں ایک نئے مقام کے ساتھ ابرِ کہسار کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

ہے بلندی سے بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا ، کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا ، بحر مرا ، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامن کہسار میں دہقانوں کے ١٠

علامہ اقبال کی نظم "ایک مکڑا اور مکھی" میں مکڑے کی کٹیا کو ایک مہلک فریب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مکڑا اپنی کٹیا کو بہت خوبصورت اور دلکش بنا کر مکھی کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے نرم بچھونے، آئینوں سے سجائی ہوئی دیواروں اور دیگر سہولیات کا لالچ دیتا ہے لیکن مکھی اس فریب میں نہیں آتی اور مکڑے کی کٹیا میں جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا یہ فیصلہ اس لیے درست ثابت ہوتا ہے کہ مکڑے کی کٹیا درحقیقت ایک مقتل گاہ ہے جہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ مکڑے کی کٹیا کا یہ تصور مکانیت کے حوالے سے بہت اہم ہے کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر چیز پس منظر میں وظائف و مصائب لیے ہوتی ہے۔ مکھی کے لیے

مکڑے کی کٹیا کی تمثیل خطرناک لوگوں سے منسلک ان کے ٹھکانوں کی ہولناکی کی بھی تصویر پیش کرتی ہے اور اشیا کی حقیقت کے بارے میں از سرِ نو سمجھنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ مکڑے کا اپنی کٹیا کا بیان ملاحظہ کیجیے:

اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا!
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا[11]

نظم "ماں کا خواب" مابعد الطبیعیاتی فکر سے تعلق رکھتی ہے اور دنیاوی مکانیت سے حیات بعد الموت کی تصوراتی مکانیت کی جانب لے جاتی ہے۔ اس ضمن میں اس نظم سے مکانیت نکال دی جائے تو بین السطور تک رسائی ہو ہی نہیں پاتی۔ مثلاً بچہ دارِ فانی سے کوچ کر کے اس مکانِ حقیقی میں منتقل ہو جاتا ہے جو اسلامی تصور حیات بعد الموت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہیں پر ماں کی عالمِ خواب میں اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ نظم اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ مکان صرف وہ جگہ نہیں جہاں ہم جسمانی طور پر موجود ہوتے ہیں بلکہ یہ وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں ہم اپنے پیاروں کے ساتھ روحانی طور پر جڑے ہوتے ہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ ہماری آنکھ انھیں نہیں دیکھ نہ پائے۔ یہ نظم اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ محبت اور خلوصِ نیت کی وجہ سے ہم اپنے پیاروں سے دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں۔ یوں نظم سے مکانیت کے اس تصور کو تقویت دیتی ہے کہ مکان صرف ایک طبعی حقیقت نہیں۔

نظم "پرندے کی فریاد" میں قفس میں بند پرندے کی داستان کے ذریعے شاعر نے انسان کی آزادی کی اشد خواہش اور قید کے احساس کو بڑی حساسیت سے بیان کیا ہے۔ نظم میں مکانیت کا تصور صرف جغرافیائی حدود تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک نفسیاتی اور روحانی حالت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ قفس ایک طبعی مقام کی قید ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفسیاتی قید بھی ہے۔ پرندے کی بے چینی اور غم اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان کی آزادی اس کی خوشی اور سکون کے لیے کتنی ضروری ہے۔ آزاد فضا آزادی، خوشی اور زندگی کی علامت

ہے جبکہ قفس قید، غم اور موت کی علامت ہے۔ یہ تضاد انسان کے داخلی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک طرف تو آزاد ہونا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ مختلف سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی قیدوں میں جکڑا ہوا ہے۔ نظم میں وجودیت کے فلسفے کے عناصر بھی موجود ہیں۔ پرندے کی بے چینی اور اپنے وجود کی تلاش اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے وجود کا معنی تلاش کرتا رہتا ہے۔ مکانیت کے ضمن میں یہ نظم انسان کی آزادی کی اہمیت، قید کے اثرات اور انسان کی اندرونی کشمکش کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کرتی ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں ، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الہٰی! دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں ١٢

"آفتاب" میں علامہ محمد اقبال نے سورج کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف دنیا کو روشن کرتا ہے بلکہ اس میں زندگی پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔ آفتاب مکانیت کے اس فلسفے کو واضح کرتا ہے کہ ہر چیز ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آفتاب کی روشنی انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کائنات کے رازوں کو سمجھ سکے۔ اس طرح آفتاب انسان اور کائنات کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی کی روشنی سے مختلف عناصر میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی بات کا اعادہ نظم "شمع" میں بھی کیا گیا ہے اور اسے بزم، مزار، کعبہ، دیر و حرم، گلشن، آشیانہ، قفس، وطن، حرم، گلستان، آتش کدہ، دار ورسن میں اجالے اور تاریکی سے جوڑا گیا ہے۔ "آفتاب" میں

اس بات کا اقرار موجود ہے کہ اسی کی روشنی سے انسان کو شعور بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ کائنات کے رازوں کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے۔ گویا سورج کائنات کے سربستہ رازوں تک رسائی کا ذریعہ بھی ہے۔

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے۱۳؎

"ایک آرزو" میں علامہ محمد اقبال نے ایک ایسے مقام و مکاں کی خواہش کرتے ہیں جہاں انسان فطرت کے قریب رہتے ہوئے پُرسکون زندگی گزار سکے۔ یہ نظم مکانیت کے اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے کہ انسان کا ماحول اس کی نفسیات اور رویوں پر گہرا اثر انداز ہوتا ہے۔ دریا کے کنارے ایک گھر، چڑیوں کا چہچہانا، چشمے کی شورش، گل اور کلیاں، سبزہ اور پانی سب مل کر ایک ایسا ماحول تشکیل دیتے ہیں جو انسان کو روحانی سکون فراہم کرتا ہے۔ یہ نظم مکانیت کے تصور کو ایک نئی جہت دیتی ہے جہاں مکان صرف ایک طبعی جگہ نہیں بلکہ روحانی سکون اور فکری آزادی کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک ایسا مکان جو اپنے تشخص کی آبیاری اور قلبی سکون کا باعث ہو۔ ملاحظہ کیجیے:

شورش سے بھاگتا ہوں ، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر ، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو ۱۴؎

نظم "رخصت اے بزمِ جہاں" ایک گہرے ناسٹلجیا اور حقیقت کے گرد بُنی گئی ہے۔ انسان کا دنیا میں قیام عارضی ہے اور لاکھ چاہنے کے باوجود اس کا عرصہ حیات ختم ہو جاتا ہے۔ ساری زندگی دنیاوی ہنگاموں سے بر سرِ پیکار رہنے کے بعد انسان آخر اس دنیا سے جاتے ہوئے جس قسم کی فکر سے تعلق رکھتا ہے، وہ اس نظم سے جھلکتی ہے۔ علامہ محمد اقبال یہاں دنیاوی رونق میلوں کی جگہ تنہائی اور فطرت کی قربت کو ترجیح دیتے ہیں اور سے

بوقتِ رخصت ایک طرح سے خوش دکھائی دیتے ہیں۔ مکانیت کے حوالے سے نظم کا مطالعہ کریں تو دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس عارضی مکان سے مستقل مکان میں تبادلے کو خوش آمدید کہتے ہیں اور دوسری یہ کہ وہ اس عارضی مکان کے ہنگاموں کے مقابل فطرت کو ایک پناہ گاہ اور روح کے لیے باعثِ سکون سمجھتے ہیں۔ یہ ان حقائق تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہے جو مابعد الطبیعاتی اور آفاقی سچائیوں کے حامل ہیں۔

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں
بسکہ میں افسردہ دل ہوں ، درخور محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے ، میں ترے قابل نہیں
بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی
ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند
ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں ؟
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کنارے پر سلاتا ہے مجھے ؟۱۵

"سرگزشت آدم" ایک ایسا فلسفیانہ اور روحانی سفرنامہ ہے جو انسان کی اندرونی جستجو کو دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حضرت آدمؑ کی جنت سے زمین پر آمد غیر مختتم سفر کا ایک ایسانقطۂ آغاز ثابت ہوا جس پر مقام کی یک دم تبدیلی شدت سے اثر انداز ہوئی۔ دنیا میں انسانیت کی آمد کا یہ سفر صرف جغرافیائی حوالے سے نہیں بلکہ ایک روحانی ارتقا بھی تھا جس میں انسان مختلف تہذیبوں، مذہبوں اور فلسفوں سے گزر کر اپنی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے جنت، زمین، کعبہ، صلیب، غار حرا، ہند، یونان، جاپان اور چین جیسے مختلف مقامات کا ذکر کرتے ہوئے انسان کے داخلی سفر کو ایک وسیع جغرافیائی تناظر میں پیش کیا ہے۔ انسان کی اس سفر میں بہتری کی کوشش اور جستجو اسے مختلف عقائد اور علم و حکمت سے روشناس کراتی ہے اور زندگی کی معنویت سکھاتی ہے۔ نظم کے اختتام پر علامہ محمد اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حقیقی سکون اور اطمینان انسان کے اندرونی سفر کے انجام پر حاصل ہوتا ہے۔

نظم "ہندوستانی بچوں کا گیت" مکانیت کے اس تصور کو تقویت دیتی ہے کہ ہر انسان کی انفرادی، اجتماعی اور قومی شناخت ہوتی ہے۔ یہ نظم ہندوستان کی عظمت کے حوالے سے مختلف تاریخی اور مذہبی شخصیات و مقامات کا ذکر کرتی ہے۔ اس خطے کو چشتی اور نانک جیسے بزرگوں نے اپنا مسکن بنایا، اس کے علاوہ تاتاری، حجازی، یونانی، ترک اور فارسی لوگ بھی منسلک رہے۔ یہ نظم ہندوستان کو ایک ایسی سرزمین کے طور پر پیش کرتی ہے جس نے دنیا کو علم، ہنر اور وحدت کا پیغام دیا ہے۔ مکانیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان کو محض ایک جغرافیائی علاقے کے طور پر نہیں بلکہ ایک تاریخی اور روحانی ورثے سے وابستہ سرزمین کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے جس نے ہندوستان کی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو ایک دھاگے میں پرو کر ایک مشترکہ شناخت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان وجوہات کے باعث علامہ محمد اقبال نے ہندوستان کی مٹی کو مقدس قرار دیا ہے اور اسے جنت سے تشبیہ دی ہے۔ گویا یہ وطن اور اس کے مکانی عناصر قومی شناخت اور استقامت کی علامت ہیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
نوح نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے ١٦

بانگِ درا کے حصہ اول کی نظموں کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ محمد اقبال نے جن مذہبی مکانات کا سب سے زیادہ ذکر کیا ہے ان میں "کوہِ طور" بھی شامل ہے۔ ان کے اس تلمیح و استعارے کا جائزہ یہ آشکار کرتا ہے کہ مختلف نظموں میں یہ بہ یک وقت طرب و کرب کی کیفیات کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کوہ طور ان کے لیے دلچسپی کا باعث اس لیے ہے کہ وہ استعاراتی طور پر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہتے ہیں یا اپنی داستان سنانا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش ان کے دیگر شعری مجموعوں میں بھی موجود ہے۔ اس ضمن میں اپنا موازنہ گلِ رنگین سے کرتے ہوئے پھول سے استفسار کرتے ہیں کہ تیرے سینے

میں وہ کونسا راز چھپا ہے جس کی وجہ سے تو خاموش ہے ؟ کیا تیری خاموشی کوہِ طور کی قربت سے فرقت کی وجہ سے ہے ؟اس استفسار کے پس منظر میں وہ وطن اور اپنے پیاروں سے دوری کے سبب اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں:

میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے۱۷

گلِ رنگین سے جواب نہ پا کر اب وہ خفتگانِ خاک سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا انھیں بھی "لن ترانی" کی صدا آتی ہے ۔ لن ترانی کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا "اے موسیٰؑ تم نہیں دیکھ سکتے "لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اللہ تعالیٰ سے محبت بھری فرمائش کی تھی۔ علامہ محمد اقبال نے خفتگانِ خاک سے استفسار کیا ہے کہ کیا تمھیں بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا یا اس مکانِ حقیقی میں بھی کوہِ طور والی ہی صدا سننے کو مل رہی ہے ؟

دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی؟
'لن ترانی' کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟۱۸

کائنات کی ہر شے کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے نظم "ہمالہ" میں کوہِ طور کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی ایک ہی تجلی کو دیکھا تھا لیکن ہمالہ کو دیکھ کر ہمیں ہر دم اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا سامنا ہوتا ہے۔اس شعر میں مکان کے دو تاریخی فریم آف ریفرنس کا موازنہ ملاحظہ کیجیے:

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے۱۹

نظم "شمع و پروانہ" میں بھی کوہِ طور کی تلمیح پیش کرتے ہوئے پروانے کا شمع کے گرد رقصاں ہونا مقامیت کے ساتھ عشق کی قربانی اور اس کے جذباتی پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔علامہ محمد اقبال شمع سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کونسی لذت اور کشش ہے جس کی وجہ سے پروانہ تیری جانب کھنچا چلا آتا ہے اور اپنی جان تک نثار کر دیتا ہے۔ یہ شعر مکانیت کے فلسفیانہ تصور کو ایک نئی گہرائی عطا کرتا ہے۔"چھوٹا سا طور" صرف ایک جغرافیائی مقام نہیں بلکہ ایک روحانی منزل بھی ہے۔ شمع کے لیے پروانے کی کشش اور محبت ملاحظہ کیجیے:

یہ جان پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے۲۰

نظم "شمع" میں بھی کوہِ طور کا حوالہ پیش کیا گیا ہے جس میں زندگی کی مشکلات کا بیان بھی ہے، سوزِ شمع سے اپنا موازنہ بھی اور یادِ ماضی کا بیان بھی۔ اس میں جہاں شمع کی مختلف ظروفِ مکاں میں روشنی پھیلانے کی بات کی گئی ہے وہیں اپنی بے بسی اور قید کا ذکر بھی ہے۔ بال خصوص قید کے مقابل "طور" کا ذکر آزادی، روحانی ترقی اور امید کی خوشی کی علامت کے طور پر آتا ہے۔

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں۲۱

نظم "دردِ عشق" کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہر دل مے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آجکل کے کلیموں کا طور ہے۲۲

یہ شعر مکانیت کے ایک دلچسپ پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں "کلیموں کا طور" ایک نئی نوعیت کی روحانی جستجو کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایسے روحانی تجربات کا بیان مقصود ہے جو جدید انسان کے لیے موزوں ہیں۔ یہاں مکانیت کا تصور محض طبعی مقام سے آگے بڑھ کر داخلی سفر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح "تصویرِ درد"، "بلال" اور "سرگزشتِ آدمؑ" میں بھی کوہِ طور کا حوالہ بہ یک وقت تلمیح و استعارہ استعمال ہوا ہے اور مکانیت کے جہانِ معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ نظموں کے اشعار بالترتیب ملاحظہ کیجیے:

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
(تصویرِ درد)۲۳

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا
(بلال رض)۲۴

کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوق تکلم میں طور پر پہنچا
(سرگزشتِ آدمؑ)۲۵

لباس نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
(ایک پرندہ اور جگنو)۲۶

نظم "کنارِ راوی" کے عنوان ہی سے مکانیت جھلکتی ہے اور نظم کا مطالعہ یہ بات عیاں کرتا ہے کہ کسی مقام سے متعلق انسان کتنی گہری فکر میں مبتلا ہو سکتا ہے، اپنے ماضی، مستقبل اور حال پر نظر دوڑا سکتا ہے اور کائنات کے اسرار ورموز کو کھوجنے کی جستجو کر سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں علامہ محمد اقبال کنارِ راوی کھڑے ہو کر اتنا مبہوت اور گہری فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں:

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدے کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو
سر کنارۂ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں ۲۷

نظم میں انھوں نے راوی کو زندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو مسلسل محوِ سفر ہے اور اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ علامہ محمد اقبال کو اس میں اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور وہ شام کے منظر میں کائنات اور انسان کے تعلق، وقت کی رفتار، اور فنا و بقا کے دائمی سفر پر غور و فکر کرتے ہیں۔ کنارِ راوی شام کا

سکوت، پانی کی آواز، اس کی شرابی سرخ رنگت، سورج کی روشنی، اور بادلوں کی حرکت ایسے تمام عناصر اس طبعی مقام کو روحانی تجربے سے بھی جوڑتے ہیں۔

یوں مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال کی شاعری میں حوالے کا مقام، مکان، ظرفِ مکاں سے انسانی تعلق (Frame of Reference) ان کی شاعری کے لیے ایسے بنیادی عناصر مہیا کرتا ہے جن سے ان کی فکر منسلک ہوتی ہے، نئے خیالات جنم لیتے ہیں، حیات و کائنات پر غور و فکر کی دعوت ملتی ہے، قومی تشخص ابھرتا ہے اور وطن کی محبت پنپتی ہے۔ ان کی شاعری میں مکانیت کا اظہار فرد کی داخلی اور روحانی کیفیات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی کُل شاعری کا جائزہ یقیناً ایک نئے جہانِ معنی کے در وا کرنے کا مترادف ہو گا۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد اقبال،ڈاکٹر، بانگِ درا،لاہور: کریمی پریس، ۱۹۲۴ء، ص۸۸

۲۔ ایضاً، ص۳

۳۔ ایضاً، ص۵

۴۔ ایضاً، ص۲۳

۵۔ ایضاً، ص۱۵

۶۔ ایضاً، ص۴۲

۷۔ ایضاً، ص۱۶

8. Iqbal, M., The Reconstruction of Religious Thought in Islam.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2011, P-01

۹۔ محمد اقبال،ڈاکٹر، بانگِ درا، محولہ بالا، ص۸

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص۱۲

۱۲۔ ایضاً، ص۲۳

۱۳۔ ایضاً، ص۳۰

۱۴- ایضاً، ص۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص۸۷

۱۷۔ ایضاً، ص۷

۱۸۔ ایضاً، ص۲۶

۱۹۔ ایضاً، ص۳

۲۰۔ ایضاً، ص۲۷

۲۱- ایضاً، ص۳۴

۲۲۔ ایضاً، ص۴۰

۲۳۔ ایضاً، ص۶۲

۲۴۔ ایضاً، ص۷۸

۲۵- ایضاً، ص۸۰

۲۶۔ ایضاً، ص۹۳

۲۷۔ ایضاً، ص۹۶